پسِ آئینہ
UNIVERSITY OF SIALKOT
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

یاسمین حمید

شاعری علم ہے۔ ماورائے ہوش
اور علمِ معلوم سے پرے کا علم۔ یاسمین حمید
کی شاعری اس نامعلوم کے علم کے لیے
تجسس کی شاعری ہے۔

نگاہِ آئینہ معلوم عکس نامعلوم
دکھائی دیتا ہے جو اصل میں چھپا بھی ہو

اِس پوشیدگی کے اسرار کی کشش شاعر کو
ایک انجانی منزل کی طرف لیے جاتی ہے۔
ایک ایسی منزل جو ایک اصل شاعر کی
انفرادی منزل ہوتی ہے۔ اِس سفر میں عجب
استعارے، قوسِ قزح میں نہائی تلمیحات اور
کسی اور دُنیا سے اُترتے دھیان اس کیلئے
قطبی ستارہ بنتے ہیں۔ یاسمین حمید بھی اسی پوشیدگی
کے اسرار کے سراغ میں ہے اور خود کہتی ہے۔

کھڑی ہوں آخری سیڑھی پہ اور پہ دیکھتی ہوں
فلک کی آنکھ میں تازہ اشارے ڈھونڈتی ہوں

منیر نیازی
لاہور ۴ ستمبر ۱۹۸۸ء

یاسمین حمید

پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز

۲۰ - ایل ڈی اے ٹاؤن ہاؤسز - نیو مسلم ٹاؤن لاہور

◎ میں حمید کی بہُت ممنون ہوں کہ اُن کے
تعاون سے اس کتاب کی اشاعت ممکن ہوئی

شاعرہ	:	یاسمین حمید
خطّاط	:	عبدالسلام شاد
سرورق	:	امجد
طابع	:	حمّاد رحیم
مطبع	:	ڈاٹ کیئر
ناشر	:	پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز
اشاعت	:	اوّل
تعداد	:	ایک ہزار
تاریخ	:	ستمبر ۱۹۸۸ء
قیمت	:	۵۰ روپے

ہمیشہ مجھ پہ اُسی کی دُعا کا رنگ کِھلا
وہ جسکی چھاؤں مِری زندگی کا رَخت ہُوئی

اپنی ماں کے نام

عکسِ حیرت کو خد و خالِ بقا دیتا ہے
ایک سایہ جو لرزتا ہے پسِ آئینہ

اِنعکاس

شاعری کیا ہے؟ اس موضوع پر ان گنت لکھا گیا اور کہا گیا مگر مجھے اس کی سادہ سی تعریف پسند آتی ہے — کہ مصوّری، موسیقی، سنگ تراشی اور افسانہ نگاری جیسے فنونِ لطیفہ کی طرح یہ بھی ایک ذریعۂ اظہار ہے، اپنے جذبوں کا، مشاہدوں اور تجربوں کا، تجزیوں اور فلسفوں کا — ایک ایسا لطیف ذریعۂ اظہار جو تخلیق کی ارفع ترین شکل ہے — اور کمالِ فن یہ ہے کہ کہی ہُوئی بات دل میں اُترے، ذہن کو مرتعش کرے، رُوح میں ایک نیا رنگ بھرے۔

اب تک شاعری میرے لیے شعوری عمل نہیں رہی، قلبی واردات رہی۔ ایک الہامی کیفیت — بوجھل ہوتے احساسات کا catharsis اسیریٔ کرب سے رہائی کے لمحے تک کا غیر شعوری سفر۔ مَیں نے کبھی منصوبے کے تحت شعر نہیں کہا، فطری تقاضے کے تحت کہا۔ شروع میں ہر شاعر (میرے خیال میں) یُونہی شاعری شروع کرتا ہے۔ بعد میں مقصدیت بھی در آسکتی ہے، نظریاتی رُوپ بھی چڑھ سکتا ہے یا محض احساسات اور خیالات کا حسین امتزاج رہ جاتا ہے، یہ کہنے والے کے مزاج پر منحصر ہے۔

پیچھے مڑ کر دیکھوں تو فنونِ لطیفہ نے مجھے ہمیشہ مسحور کیا ہے۔ سُر اور لَے میں بندھے الفاظ سے رشتہ، موسیقی سے لگن بہت پرانی ہے۔

مصوری سے بھی دلچسپی رہی۔ طالب علمی کے زمانے میں گرمیوں کی طویل چھٹیاں رنگوں سے کھیلتے اور تجربے کرتے گزارا کرتی تھی۔ لیکن کسی بھی فن کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ ہوم اکنامکس کالج لاہور سے بی ایس سی کی ڈگری لی اور Nutrition میں .hons کے ساتھ ایم ایس سی کیا۔ اور اب تدریس سے وابستہ ہوں۔

غیر نصابی سرگرمیوں، مباحثوں، موسیقی کے مقابلوں اور ڈراموں میں حصہ لینے کا جنُون کی حد تک شوق تھا۔ شاید اُس وقت میرے اندر کا فنکار اپنے اظہار کے لیے مناسب میڈیم کی تلاش میں تھا ——

اور پھر اُس نے شاعری کو چنا۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ میں نے خود کو بطور شاعر قدرے دیر سے دریافت کیا اور جب کر لیا تو جانا کہ میں دراصل یہی ہوں —— اور اب شاعری زندگی کا جُزو ہے۔

معلُوم نہیں یہ بات اچھی ہے یا بُری، اپنے آپ کو شعر کہنے پر کبھی مجبُور نہیں کر سکی۔ جب طبیعت مائل ہُوئی تو ایک دِن میں چار چار غزلیں بھی کہیں اور جی نہ چاہا تو کئی کئی مہینے یُونہی گزر گئے۔ البتہ انھی خشک موسموں میں کبھی کبھی یہ خیال بلکہ خوف سا آیا کہ کہیں یُوں نہ ہو کہ اب کبھی شعر کہہ ہی نہ سکوں لیکن آج تک ایسا ہُوا نہیں اور خُدا کرے کبھی نہ ہو۔

محسوس کرنا اور اس کے اظہار کو ممکن بنانا اختیار کی بات نہیں۔
یہ صلاحیت فطرت سے ملتی ہے کسی کو زیادہ، کسی کو کم۔ ہاں اس سے انکار
نہیں کہ ریاضت اور مطالعے سے اظہار میں نکھار پیدا ہو جاتا ہے — یہ
محنت اور ریاضت بھی کسی کسی کے حصّے میں آتی ہے۔ اس میں کچھ تو
اپنے عزم کا، کچھ صُورتِ حالات کا اور کچھ مقدر کا دخل ہوتا ہے۔

شاعری کیوں کرتی ہوں اور کیسے کرتی ہوں — ان سوالوں کے جواب
تو شاید دے چکی۔ میری شاعری کیا ہے اس کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑنا
چاہوں گی — اتنا ضرور کہتی چلوں کہ مجھے سچائی سے محبت اور جھوٹ
سے نفرت ہے۔ جُھوٹ جیت کر بھی خائف رہتا ہے اور سچائی ہار کر
بھی مطمئن۔ سچ کہنے والا دنیا کی نگاہوں میں تو گر سکتا ہے لیکن اپنی نگاہ
میں بہت بلند ہو جاتا ہے۔ یہی اس کی جیت ہے اور یہی اس کا حاصل۔
یہ مجمُوعہ اسی سچائی اور خلُوص کا نچوڑ ہے — یہ تو میرا اپنا تجزیہ ہے۔ آپ
اس پر جو بھی فیصلہ ثبت کریں، سر آنکھوں پر — اپنے طور پر میں مطمئن
ہوں کہ جو بھی کہا، جیسا بھی کہا، خلُوص سے کہا، دل سے کہا اور ڈوب کر کہا۔

یاسمین حمید

پسِ آئینہ

اِرتکاز

کسی انداز سے دینا، شفائے بال و پر دینا
سکوتِ عرصۂ جاں کو نویدِ رہگذر دینا

کہیں آغوش میں سورج کہیں ہوں چاند کی کرنیں
مری مٹّی کو یہ سرمایۂ شام و سحر دینا

کٹھن رستہ سہی، تکمیل کا چہرہ دکھا دینا
سمندر زندگی کو ساحلِ رنجِ سفر دینا

دلِ آتش نما بھڑکے تو بینائی چمک اُٹھے
جلانے کی بجائے روشنی دے، وہ شرر دینا

کبھی مظلوم کے ہاتھوں میں ظالم کی سپر دے کر
ضمیروں کی کجی کو اپنے ہونے کی خبر دینا

ترے فنکار کی اپنے لیے بس عرض ہے اتنی
خوشی سے رنج و غم دینا مگر تابِ ہنر دینا

مِرے چراغ، تُو میرے لیے نہ ہو محدود
خُدا کرے مَیں تری روشنی کو بانٹ سکوں

کنارے پر کھڑی ہوں اور کنارے ڈھونڈتی ہوں
سحر کی روشنی میں چاند تارے ڈھونڈتی ہوں

لہو کی روشنائی سے جنہیں لکھا گیا ہو
مَیں طاقِ عُمر میں ایسے شمارے ڈھونڈتی ہوں

وہ جن کو میرا بچپن سوچتا اور چاہتا تھا
کِسی کی ذات میں وہ رنگ سارے ڈھونڈتی ہوں

مسافت کی تھکن، تسکین و یکسوئی کا سایہ
مَیں تکمیلِ سفر کے استعارے ڈھونڈتی ہوں

کھڑی میں آخری سیڑھی پہ اُوپر دیکھتی ہُوں
فلک کی آنکھ میں تازہ اشارے ڈھونڈتی ہُوں

مجھے ہر منجمد شَے موت کا پرتَو لگی ہے
مَیں تصویروں میں بھی زندہ نظارے ڈھونڈتی ہُوں

تیز رَو پانی پہ بہنے کا ارادہ اور مَیں
بند باندھے رہ نہ جائیں جوشِ دریا اور مَیں

اِک سمندر اِس طرف ہے، اک سمندر اُس طرف
بیچ میں خُشکی کا ناہموار رستہ اور مَیں

آئنہ ٹُوٹا ہُوا ہے عکس ہے بکھرا ہُوا
کرچیوں پہ خُون کے دھبّوں کا نقشہ اور مَیں

رقص گاہِ زندگی میں ناچتے ہیں ساتھ ساتھ
وحشتِ حالات کا بدمست چہرہ اور مَیں

ایک جلتے کھیت کو آباد کرتے کس طرح
آنکھ سے بہتا ہُوا پانی کا چشمہ اور مَیں

ایک لاحاصل سفر پر چل رہے ہیں ساتھ ساتھ
اک کسی کے نام کا بے ربط رشتہ اور مَیں

لاپتہ ہیں ایک گُم گشتہ جزیرے پر ابھی
اِک مسافر میرے اندازے سے گہرا اور مَیں

اختیار میں اپنے وقت کا اشارا ہو
ایک ہاتھ میں رستہ، ایک میں ستارا ہو

بے نصاب لمحوں کو اِس طرح سنوارا ہو
ایک پل پہ نام اُس کا، ایک پل ہمارا ہو

یوں نہ ہو کہ آوازیں راستے میں کھو جائیں
اُس سمے جواب آئے جس سمے پکارا ہو

شب نما حقیقت پر دُھوپ سی ٹھہر جائے
عکس اُسکے پیکر کا اِس طرح اُتارا ہو

اِذن کے توسط سے خُوبیاں عیاں ہونگی
کوئلے کے قالب سے جسطرح شرارا ہو

اِک فریب ہو ایسا جو نہ کھا سکے کوئی
دُور سے بھَنور جیسا، پاس سے کنارا ہو

چاند کس سوچ میں ہے، بحر کا پانی بولے
مجھ پہ مرکوز ہے، اشکوں کی روانی بولے

اک نیا خاکہ، لکیروں کا سیہ نقطوں کا
بیچ میں رنگ نما بات پرانی بولے

مہرباں، تم پہ رہے مٹی بھی بہت سُورج بھی
سبز پتوں سے یہ موسم کی گرانی بولے

کیوں اندھیرا ہی ٹھکانہ تھا مری خوشبو کا
دن چڑھے سہمی ہوئی رات کی رانی بولے

کس کی وحشت نے مجھے جامۂ تحریر دیا
اپنی تخلیق پہ شرمندہ کہانی .بولے

ایک ہی بُوند ہوں، سیپی میں چُھپا لو مجھکو
ورنہ اُڑ جاؤں گی، بارش کی نشانی .بولے

تُو بدل کر کبھی انداز پذیرائی کا
اِمتحاں لے مرے احساس کی بینائی کا

آئی جب اُسکے مقابل تو نیا بھید کُھلا
مُجھ کو اندازہ نہ تھا اپنی توانائی کا

اُس نے بس سطح پہ چلنے کا سلیقہ سیکھا
اور سمجھنا تو مجھے، کام تھا گہرائی کا

بھیڑ کے شور میں آواز نہ گم ہو جائے
اِس لیے ذکر نہیں کرتے ہیں تنہائی کا

رُوح کی کوکھ ہمیشہ ہی تہی رہتی ہے
چہروں پہ غازہ سجا رہتا ہے زیبائی کا

وقت نے کوئی گرہ کھولی نہیں ہے اب تک
بس لئے پھرتا ہے اک زعم مسیحائی کا

کھو گیا کثرتِ گویائی کے ہنگامے میں
ایک جو حرف تھا گفتار میں دانائی کا

اب کُھلے رکھیے مناجاتوں کے در
حرف سے ٹپکائیے خُونِ جگر

جب دیارِ ذات میں کُچھ بھی نہیں
کیا ہُوا جو گر گئے دیوار و در

یہ نہیں لازم کہ منزل ہو وہاں
ختم ہو جب بھی کہیں کوئی سفر

دیکھیے چٹخیں گے انگارے بہت
کیوں دیئے پانی کے چھینٹے آگ پر

کیوں تھکن کا عکس بن کر جم گیا
کیوں نہیں مٹتا نشانِ رہگذر

کون چُھو کر اِنتہا کو آئے گا
کِس پہ ہو گا انکشافِ بال و پر

بس اچانک ہی اندھیرا ہو گیا
جس طرح یک لخت چمکی تھی سحر

کِس لیے خاکہ ادُھورا رہ گیا
یہ نہ بتلائے گا کوئی نقش گر

بیٹھے بیٹھے دفعتاً اُس کا خیال آنے لگا
سوچ کی بے سمت پرِ وازوں پہ جال آنے لگا

وقت کی دیوار پر اُبھرے ہیں پھر اُسکے نقوش
یاد مجھ کو وہ نگارِ ماہ وسال آنے لگا

کس طرح برسوں ہوا کے ہاتھ پر بیٹھی رہی
ذہن میں پھر سے وہی اندھا سوال آنے لگا

رُوح کی تکسیر سے پیوند جیسے کُھل گئے
جرأتِ اظہار کا مجھ میں کمال آنے لگا

ایک چنگاری ہی ذکرِ ناروا کی تھی بہت
برف جیسے سرد پانی میں اُبال آنے لگا

جو محرّک تھے مری تعمیر کے وہ کیا ہُوئے
کیوں ترے اعجاز پر دورِ زوال آنے لگا

خُوبیوں کے جتنے بھی تھے استعارے چھُپ گئے
جب سے بزمِ شوق میں وہ بے مثال آنے لگا

گُزر گیا دِن مراعتوں کا، مدارتوں کا
رکھا ہُوا ہے حساب ہیں نے بھی ساعتوں کا

جو گُل بکف لمحے شاخِ ہستی پہ بوجھ ٹھہرے
چُکایا جائے گا قرض اُنکی عنایتوں کا

یہ حرف کیا ہیں، یہ لَے ہے کیسی، یہ راگ کیسا
بدل گیا گیت تیری میری سماعتوں کا

وجُود سے آسکے جو باہر تو کِتنا پھیلے!
طویل تر سلسلہ ہے اندر شکایتوں کا

مرا جزیرہ نئی زمینوں سے کٹ گیا ہے
پُرانا ہے متن دل کی تازہ عبارتوں کا

یہ قتل گاہیں جو گر رہی ہیں تو شور کیسا
یہ کس لیے ہو رہا ہے ماتم روایتوں کا

مَیں اپنی ذات کے محدود جنگل سے نکل جاؤں
اگر وسعت کی پروردہ ہُوں جنگل سے نکل جاؤں

مَیں بجلی ہوں، شرارہ ہوں اگر بادل کے اندر ہوں
اور اِک رحمت کا قطرہ ہوں جو بادل سے نکل جاؤں

شکستہ خواب ہوں ماضی کا، میں اک دردِ پیہم ہوں
مَیں فردا کی زمیں ناپوں اگر کل سے نکل جاؤں

مقید آنکھ میں گر ہُوں تو ادنٰے کیوں سمجھتے ہو
میں حجمِ دریا ہو جاؤں جو چھاگل سے نکل جاؤں

مَیں باہر جی نہیں سکتی ہُوں اندر مَر نہیں سکتی
سو پانی کے خُدا کا حُکم ہے جل سے نکل جاؤں

نہ مَیں نے تیرنا سیکھا نہ خُشکی پر سفر کرنا
مگر پھر بھی یہ خواہش ہے کہ دلدل سے نکل جاؤں

ایک بحرِ سرد جیسے ساحلوں کے درمیاں
درد کا پھیلاؤ ہو گا فاصلوں کے درمیاں

شام ہونے سے ذرا پہلے لیا تھا راستہ
اور اِک شب پڑ گئی ہے منزلوں کے درمیاں

رابطہ اپنی جگہ تھا، فاصلہ اپنی جگہ
تھی سبیلِ ضبط محکم قافلوں کے درمیاں

آج کا انسان بھی تسخیر کر سکتا نہیں
جو خلائیں ٹھہر جاتی ہیں دِلوں کے درمیاں

تلخیوں کا زہر پینے کی تو عادت ہے مگر
تھوڑا وقفہ دیجئے اِن سلسلوں کے درمیاں

اِس طرح بانٹی خُوشی کہ ہاتھ خالی ہو گئے
کھو گیا پھر دینے والا سائلوں کے درمیاں

ہر گواہی پر وہی تعزیر کا مرکز بنا
ایک جو معصُوم تھا سب قاتلوں کے درمیاں

دیکھتے ہیں مگر زبان نہیں
بات بھی قابلِ بیان نہیں

پھر ستارہ مری طرح ٹوٹا
آسماں پر کوئی نشان نہیں

جس کے دیوار و در کی قیمت ہے
وہ سرائے ہے سائبان نہیں

ایک ایسا چراغ ہے مجھ میں
جس کا اپنا کوئی مکان نہیں

پہلے تو مسئلہ ہَوا کا تھا
اب ہَوا ہے تو بادبان نہیں

رزم تو قیر میں قدم رکھیں
کُند لفظوں میں اِتنی جان نہیں

جتنا دشمن مرا ہراساں ہے
اِتنا مشکل تو امتحان نہیں

مَیں نے اُس کا گریز دیکھا ہے، مَیں نے اُس کا عتاب دیکھا ہے
اُس کا یہ رنگ دیکھ کر اُس کو برسرِ انتخاب دیکھا ہے

یُوں تو اندر ہزار موسم ہیں، دید کو بے شمار منظر ہیں
آج سَرما کی دُھوپ میں لیکن دشت کو بے نقاب دیکھا ہے

قریہ قریہ، ترے علاقے کا، حدِ فاصل کا علم ہے مُجھ کو
سبز، خوش رنگ خواب دیکھا تھا، جانتی ہوں سراب دیکھا ہے

ایک چہرے پہ تھیں تہیں کتنی، منعکس کیوں نہیں ہُوا اُس سے
اپنی بیچارگی کی خِفّت سے آئنہ آب آب دیکھا ہے

میں اُن آنکھوں کو دیکھنا چاہوں، جن کی حیرت گہِ تماشا نے
شوقِ پرواز کی حدیں چھوتا، آسماں پر حباب دیکھا ہے

اُس طرف دُھوپ کے نہ ہاتھوں نے اُسکی بُوندیں کہیں اڑالی ہوں
اپنے خطّے پہ تیرتا اکثر یُوں تو مَیں نے سحاب دیکھا ہے

خُوب سے خُوب تر کی خواہش میں رُوح یک سمت ہوگئی ایسے
پھُول جتنے تھے سب ہُوئے اوجھل آنکھ نے بس گلاب دیکھا ہے

عجب نہیں جو کوئی رہ نوردِ خواب لگے
سراب ہے تو مجھے کیوں نہ وہ سراب لگے

وہ ایک لمحہ جسے وقت کی ہوا نہ لگی
خزاں کی دُھوپ میں کِھلتا ہوا گلاب لگے

یہاں پہ سیلِ حوادث کیلئے کچھ بھی نہیں
کہ دل کا شہر تو پہلے ہی زیرِ آب لگے

شمار چاہتی ہے وقت کی بھی چارہ گری
کرے وہ کیا کہ جسے زخم بے حساب لگے

یہ اپنی اپنی نظر کا معاملہ ٹھہرا
کسی کو ذرّہ ، کسی کو وہ آفتاب لگے

شمار اُسکا بھی موجوں کی آب و تاب میں ہے
جو سطحِ آب پہ بہتا ہُوا حباب لگے

شام ہُوئی تو جل اُٹھا دیکھو چراغِ یاس بھی
تُو ہے تھکی تھکی ہُوئی ردیا ہُوا اُداس بھی

درد کی تیز آندھیاں چھُو کے کسے گزر گئیں
گرد و غبار رہ گیا کُچھ میرے آس پاس بھی

جب سے ندی نظر میں تھی اتنا کٹھن نہ تھا سفر
پانی کی دید سے فقط، بھُولے ہُوئے تھے پیاس بھی

دیکھتے دیکھتے یہاں ایک مکاں تو بن گیا
کاش کسی کو ہو نصیب، آئے کسی کو راس بھی

پہلے زمینِ سنگ کو اپنے لہُو سے تر کروں
پھر مجھے اُس زمین سے آئے وفا کی باس بھی

کشتی کا بادبان ہی کشتی پہ بوجھ ہوگیا
ڈوبے گی بھی تو اِس طرح اُسکو نہ تھا قیاس بھی

سوچا جو مَیں نے بارہا، اب وہ حقیقتاً بھی ہو
خواب کے ساتھ دیکھ لوں خواب کا التباس بھی

زخم کو آبروئے جاں کر لو
خیمۂ غم کو سائباں کر لو

اُس کے چھوڑے ہُوئے الاؤ کو
اپنی ہی کھوج کا نشاں کر لو

خواب کی بھی عجیب دُنیا ہے
جس کو بھی چاہو مہرباں کر لو

دونوں جانب اگر تلاطم ہے
راستہ اپنا درمیاں کر لو

درد کی ناؤ کو سنبھالا دو
اپنی وحشت کو بادباں کر لو

عکس کا اِنتخاب کرنا ہے
آئنہ زیرِ آسماں کر لو

بیٹھ کر آبشار کے نیچے
آبِ روشن کو بھی دُھواں کر لو

اکثر آنا، سوچ کے دَر پر دستک دینا
بُھول نہ جانا دھیان نگر پر دستک دینا

دِیا جلائے رکھنا طاقِ بے خبری میں
بُھولی بسری راہگذر پر دستک دینا

نرم ہواؤ! کیوں گھبرا کر لَوٹ گئی ہو
اب آؤ جو میرے گھر پر، دستک دینا

دَر کُھل جائے تو کرنوں کا ہالا پہنو
اے شب زادو! کفِ سحر پر دستک دینا

سارے حَرف دُعاؤں کے مایُوس کھڑے ہیں
آگے بڑھ کر جائے اثر پر دستک دینا

نگاہ اپنے لیے ایک معجزہ چاہے
ہر آئنے میں ترا عکس دیکھنا چاہے

بہت ہی تیز ہے خنجر کسی کے لہجے کا
مرے سِلے ہُوئے ہونٹوں کو کھولنا چاہے

صدا بلند ہے اتنی کہ کان پھٹتے ہیں
ہے اذن ایسا کہ گونگا بھی بولنا چاہے

نیا مکان بنانے کے واسطے کوئی
بنی بنائی عمارت کو توڑنا چاہے.

لگا ہُوا ہے مِری ٹوہ میں مِرا دُشمن
پسِ غبار کھڑا دل میں جھانکنا چاہے

ندی کا پاٹ بہت تنگ لگ رہا ہے اسے
ہماری ناؤ سمندر کا راستہ چاہے

ہم نے کسی کو عہدِ وفا سے رہا کیا
اپنی رگوں سے جیسے لہُو کو جُدا کیا

اُس کے شکستہ وار کا بھی رکھ لیا بھرم
یہ قرض ہم نے زخم کی صُورت ادا کیا

اِس میں ہماری اپنی خُودی کا سوال تھا
احساں نہیں کیا ہے جو وعدہ وفا کیا

جس سمت کی ہَوا ہے اُسی سمت چل پڑیں
جب کچھ نہ ہو سکا تو یہی فیصلہ کیا

عہدِ مسافرت سے وہ منسُوخ ہو چکی
جس رہگذر سے تم نے مجھے آشنا کیا

اپنی شکستگی پہ وہ نادم نہیں ہوا
میری برہنہ پائی کا جس نے گِلہ کیا

دُکھ جو اپنے حصّے کا ہے سہنا ہو گا
ہنسنا ہو گا اور خاموش بھی رہنا ہو گا

جس سے دُنیا خوش ہو بات وہی ہے سچّی
آگ کو پانی، موم کو پتّھر کہنا ہو گا

دُھوپ وفا کی ساری نفرت پگھلا دے گی
برف بجمے دریاؤں کو بھی بہنا ہو گا

رُت بدلی تو سارے پنچھی اُڑ جائیں گے
جھڑ جائیں گے پتّے، پیڑ برہنہ ہو گا

مدّتوں سے خواب میں دیکھا نہیں تھا
یہ شگونِ بے رُخی اچھا نہیں تھا

دن بھی اُجلا، رات بھی مہتاب کندہ
صرف بینائی کا دَر کُھلتا نہیں تھا

دستکیں دیں اور پھر دَر توڑ ڈالا
گھر کا کوئی فرد بھی زندہ نہیں تھا

شہر جس میں راکھ کی اینٹیں چنی تھیں
آگ سے محفوظ تھا، جلتا نہیں تھا

کیوں پروں کے کاٹتے ہی مر گیا وہ
جو پرندہ شوق سے اُڑتا نہیں تھا

ذات کو گہرائیاں تو دے گیا ہے
درد کا سیلاب جو پھیلا نہیں تھا

جاؤ تم، عادی ہے دل ویرانیوں کا
اِس میں پہلے بھی کوئی رہتا نہیں تھا

سفر کا استعارہ کھو گیا ہے
مسافر راستے میں سو گیا ہے

جو دُکھ اگلی رتوں کو سینچنا تھا
اُسے وہ احتیاطاً بو گیا ہے

اگرچہ سانحہ طُوفاں صفت تھا
مکدّر زندگی کو دھو گیا ہے

کوئی حرفِ صفا ایسا تو ہو گا
براہِ راست جو دل کو گیا ہے

کھڑا ہو گا تذبذب کی حدوں پر
ابھی اُٹھ کر یہاں سے جو گیا ہے

سلاخیں توڑ کر بھی کیا ملے گا
سزا کا فیصلہ تو ہو گیا ہے

ترے لشکر کا اک اِنصاف پرور
ہماری صف میں شامل ہو گیا ہے

کُچھ غبارِ درد کے پھیلاؤ میں دِکھتا نہ تھا
اُس شباہت پر کسی بھی حرف کا چہرہ نہ تھا

گھر کی دیواروں کے گر جانے کا مجھ کو خوف تھا
بے سبب طُوفان میں، مَیں نے قدم رکھا نہ تھا

حجمِ دریا دیکھ کر کتنا تاثر لے لیا
پاؤں جو رکھا تو پانی اِس قدر گہرا نہ تھا

آبلوں نے بھی جسے پہچاننے میں دیر کی
اتنا ناہموار رستوں میں کوئی رستہ نہ تھا

چند قطروں میں سمندر کی صفت موجود تھی
آنکھ میں لکھّی ہُوئی تحریر نے جانا نہ تھا

شام کا پہلا ستارا ڈوبا
اِک مسافر کا سہارا ڈوبا

کم نگاہی نے اُسے مار دِیا
موج کی ضِد میں کنارا ڈوبا

گِننے نکلا تھا بھنور کے چکّر
اِس تجسّس میں بچارا ڈوبا

کُچھ تو گہرائی میں لذّت ہوگی
اُس سے پُوچھو جو دوبارہ ڈوبا

اُس نے چلنے کو کہا تھا لیکن
بھیڑ میں اُس کا اشارا ڈوبا

ایک اِک نقش نے مبہُوت کیا
جیسے آنکھوں میں نظارا ڈُوبا

موجۂ عشق ہے طُغیانی پر
پھر کوئی بخت کا مارا ڈُوبا

وہ بہارِ ہستی سے اِنتخاب کیا دیتا
بیج ہی نہ جب بویا، پھر گلاب کیا دیتا

آپ تھی زباں بستہ اُس سے کیا گلہ کرتی
میری بے نوائی کا وہ جواب کیا دیتا

اعتماد کی نسبت بات تھی کہیں چھوٹی
پُوچھ کے میں کیا کرتی، وہ حساب کیا دیتا

بے طلب رہی ہوں مَیں مانگتی بھی کیا اُس سے
مَیں تو خُود اُجالا تھی، آفتاب کیا دیتا

اِس میں تھا قصور اُس کا اور نہ تھی خطا میری
خام تھا جب آئینہ آب و تاب کیا دیتا

باریاب ہو جاتی گر دُعائے آخر بھی
میری بے گناہی پہ وہ عذاب کیا دیتا

آج اندر بھی روشنی کم ہے
اور دریچے کا پاٹ بھی کم ہے

کس لیے ہاتھ باندھ دوں اُسکے
کیا مجھے اپنی بے بسی کم ہے

وقت کٹتا نہیں کسی صُورت
لوگ کہتے ہیں زندگی کم ہے

اُس کی چاہت کا رُوپ تھا شاید
آج چہرے پہ تازگی کم ہے

دُشمنی تو نہیں ہے لوگوں سے
بس ذرا اُن سے دوستی کم ہے

اپنے ، غیر برابر دیکھے
سب ہاتھوں میں پتّھر دیکھے

کوئی شہرِ ذات سے گزُرے
صحرا بیچ سمندر دیکھے

جن سے خوف زدہ ہیں پتّھر
ایسے کانچ کے پیکر دیکھے

سیپ کا کوئی مول نہیں ہے
دیکھنے والا گوھر دیکھے

ایک نظر کیا اُس کو دیکھا
دُنیا کے سب منظر دیکھے

چاہت کی بے لاگ نظر نے
عیب نہ ڈھونڈھے جوہر دیکھے

اوروں سے منسُوب ہُوئے ہیں
خواب جو ہم نے اکثر دیکھے

یادوں کے آسیب سے نکلے
دل سے کہہ دو باہر دیکھے

دن کی روشنی میں ہی اب چراغ جلتے ہیں
رات کے اندھیرے میں صرف داغ جلتے ہیں

ایسے ابر سے سوچو ریگ زار کیا لیتا
یہ تو جب برستا ہے اِس میں باغ جلتے ہیں

راہ میں بچھی آنکھیں اب سُراغ ہیں میرا
جب وہ راہ چلتا ہے یہ سراغ جلتے ہیں

دل بھی جب سُلگتے ہیں ٹُوٹ پُھوٹ ہوتی ہے
انقلاب آتا ہے جب دماغ جلتے ہیں

لمس میرے ساقی کا شعلہ بار تھا اتنا
مے کدۂ ھستی کے سب ایاغ جلتے ہیں

اِک دیا تھا جو دُعا کے اندر
جل رہا ہو گا خُدا کے اندر

جُرم کا بوجھ اُتر جاتا ہے
یہ جزا بھی ہے سزا کے اندر

زخم کی آنکھ کھُلی رہتی ہے
زہر ملتا ہے دوا کے اندر

چاہتیں کارِ وضو کرتی ہیں
ڈوب کر جُوئے وفا کے اندر

رُوح کے شہر میں سنّاٹا ہے
جیسے ماتم ہو صَدا کے اندر

خشک موسم کی فراوانی بھی
ہے مری آب و ہوا کے اندر

شجر سے شاخِ دریدہ کو بڑھ کے کاٹ سکوُں
پھر اپنے ہاتھ سے اُس کا وجود پاٹ سکوُں

مزا ہیں موت کا چکھوں اِسی حوالے سے
ترے بغیر مگر زندگی تو کاٹ سکوُں

مسافرت کے قرینے سے بے خبر بھی نہیں
مگر یہ کیا ہے کہ دل مائلِ سفر بھی نہیں

نہ جانے کیوں ہے سفر اس قدر کٹھن جبکہ
سحر کا ساتھ بھی ہے سمت پُر خطر بھی نہیں

جو پاس رختِ سفر تھا وہ کب کا لُٹ بھی چکا
ہمیں تو راہ میں لٹنے کا کوئی ڈر بھی نہیں

قدم سنبھال کے رکھنا کہ دشتِ ذات میں اب
بَلا کی دُھوپ ہے اور سایۂ شجر بھی نہیں

بڑا عجیب ٹھکانہ ہے اُس مسافر کا
کہ جس کا گھر بھی نہیں ہے جو دربدر بھی نہیں

دُور رہنے کی سزا دو مُجھ کو
چاند کا نقش بنا دو مُجھ کو

حرفِ اوّل کو لہُو سے لکھو
حرفِ آخر ہُوں مِٹا دو مُجھ کو

ایک ننّھی سی کرن کیا لوگے
دُھوپ کے ساتھ مِلا دو مُجھ کو

قطرۂ آب ہَوا بن جائے
یُوں بکھرنے کی دُعا دو مُجھ کو

سبز پتّے نہ سہی زرد سہی
کوئی موسم تو دِکھا دو مُجھ کو

برف کی سِل پہ دہک اُٹّھا جو
ایسا شعلہ ہُوں، ہوا دو مُجھ کو

دِل کی میزان پہ تولوں تو برابر دیکھوں
پُھول دیکھوں کبھی اُس ہاتھ میں پتھر دیکھوں

لاپتہ ہی نہ تہہِ آب پڑی رہ جاؤں
اپنے احساس میں اندیشۂ گوہر دیکھوں

ایک قطرہ ہوں پہنچنا ہے سمندر میں مجھے
ہاں تو پہلے کسی دریا میں اُتر کر دیکھوں

ایک تنکے سے کہیں شاخ میں خم آجائے
آشیاں کتنے کہیں ایک شجر پر دیکھوں

کیوں نہ میں آخری پرواز کی دوں داد اُسے
کس لیے اُس کے میں ٹوٹے ہُوئے شہ پر دیکھوں

لاکھ رہ میں آندھیاں ہوں نقشِ پا مل جائے گا
دِل اگر سچّے ہُوئے تو راستہ مل جائے گا

دل میں جو شکوے رہیں گے آتشیں ہو جائینگے
اِک شرر سے اِک شرر کا سلسلہ مل جائے گا

نفس کے دشتِ بلا میں ہمرہوں کی کیا کمی
خواہشوں سے خواہشوں کا قافلہ مل جائے گا

ایک ادنیٰ پیڑ کی موجُودگی بھی ہے بہُت
ننّھے پھُولوں کو شجر سے حوصلہ مل جائے گا

راستہ ہموار ہے تو خُود چٹانیں ڈال دو
تُم کو سر کرنے کی خاطر مرحلہ مل جائے گا

جھٹپٹے سے جب نکل کر روشنی میں آؤں گی
اپنی بابت کچھُ نہ کچھُ تو فیصلہ مل جائے گا

ہمیں خبر تھی بچانے کا اُس میں یارا نہیں
سو ہم بھی ڈوب گئے اور اُسے پکارا نہیں

خود آفتاب مری راہ کا چراغ بنے
مگر یہ بات مرے چاند کو گوارا نہیں

جو اُس میں اُتری تو طوفان ہی ملیں گے مجھے
میں جانتی ہوں کہ وہ موج ہے، کنارا نہیں

عجب فضا ہے کہ رنگِ نمودِ صبح بھی ہے
سیاہ رات نے بھی پیرہن اُتارا نہیں

وجُودِ جس کو کسی معتبر شجر نے دیا
ہوَا کی زد میں بھی تنکا وہ بے سہارا نہیں

جلے گا خود بھی سحر تک مُجھے بھی لَو دے گا
چراغِ شام کوئی بخت کا ستارا نہیں

دل کی بات ضروری بھی ہے
بیچ میں اِک مجبُوری بھی ہے

ہے تکمیل کی خواہش بھی اور
ابتک بات ادھوری بھی ہے

دریا کے ہیں کنارے ہم تُم
قُربت بھی ہے دُوری بھی ہے

ہے دل کی آواز بھی شامل
کچھ یہ ذکر شعُوری بھی ہے

اصل حقیقت رُوح کا بندھن
یوں یہ حکایت پوری بھی ہے

ہے بہت لمبی کہانی رات کی
روشنی بھی ہے نشانی رات کی

علم اپنی اہمیت کا کیا ہُوا
پھر چراغوں نے نہ مانی رات کی

روشنی کو اپنے ذمّے لے لیا
مُجھ کو دے دی پاسبانی رات کی

رنگ کا پھر حُسن بے بس ہو گیا
خوشبُو کہلائے گی رانی رات کی

دن کے پردے سے بھی اکثر جھانکنا
یہ شرارت ہے پرانی رات کی

کر دیا بُوند کو دریا مَیں نے
خواب اچّھا تھا جو دیکھا مَیں نے

کر لیا اپنے سفر کو دشوار
ناپ کر پہلے سے رستہ مَیں نے

اُس پہ پرواز بھلی لگتی تھی
اِس لئے جال نہ پھینکا مَیں نے

گرچہ مُجرم تو ہوَا کہلاتی
پھر بھی غنچے کو نہ توڑا مَیں نے

بعد سہ پہر مَیں گھر سے نکلی
کیوں نہ دیکھا کہیں سایہ مَیں نے

ذات اُس کی وہ سمندر جس میں
ڈوب کر پایا کنارہ مَیں نے

شہر میں سَر پیٹتا بارش کا شور

رُوح میں زنجیر پا خواہش کا شور

آخری تفتیش بھی پُوری ہُوئی

زیرِ لب پھیلا رہا سازش کا شور

حدِّ فاصل پر کھڑا تھا منتظر

پھر دَر آیا شہر میں یورش کا شور

آتشیں لاوے کی صورت گُنگ ہے

اب زمینِ ضبط میں بندش کا شور

تیز دھڑکن سے مبدّل ہو گیا

آنکھ کی بے دست و پا جنبش کا شور

نواح میں بسی ہُوئی مہیب بستیاں
دَر آ رہی ہیں شہر میں عجیب بستیاں

بناتے، روندتے ہیں انھیں فیصلوں کے ہاتھ
ہدف ہیں موسموں کا بد نصیب بستیاں

کِسی کے مہرباں اشارے کی ہیں منتظر
اٹھائے اپنے کاندھوں پہ صلیب بستیاں

اچٹتی نیند سوتے ہُوئے خوابِ دشت میں
نگہ میں جھلملاتی ہیں حبیب بستیاں

مسافروں کے حوصلے کا اِمتحان ہیں

طویل راستوں کی ہیں رقیب بستیاں

زمین تنگ ہو گئی نجات کیلئے

خلاؤں میں بنائیے مجیب بستیاں

سوچ پر جب سزائے بندش ہو
کیسے موجِ طلب میں جنبش ہو

زرد آندھی ہے سُرخ بادل ہے
پتّھروں کی کہیں نہ بارش ہو

رقص میں ہے چراغ کی لَو بھی
تیرگی سے کہیں نہ سازش ہو

شب طوالت میں اور بڑھ جائے
کُچھ ستاروں کی یہ نہ خواہش ہو

آگ بُجھتی نہیں ہے پانی سے
کوئی جلوہ تہِ زیرِ آتش ہو

پیاس ہے اور آبِ شیریں ہے
پیالہ بھرنے کی اپنی کوشش ہو

کھینچ کے آگیا ہو جو پچھلے دَور کی زَد میں
آنے والے وقتوں کا ایسا ایک لمحہ ہُوں

فصلِ دل میں نئے زخم بو جائیں گے
جانتے ہیں وہ دامن بھگو جائیں گے

راستہ دیکھتے دیکھتے ایک دِن
آنکھ لگ جائے گی لوگ سو جائیں گے

ایک دن سب مسافر اُتر جائیں گے
مہرباں کشتیوں کو ڈبو جائیں گے

آپ اندر کے موسم کو سمجھیں گے کیا
چہرہ دیکھیں گے اور بیج بو جائیں گے

یہ کہانی جو لکھی ہے دیوار پر
لکھنے والے اسے خود ہی دھو جائیں گے

کسی نے حشر برپا کر دیا ہے
سمندر کو جو قطرہ کر دیا ہے

خوشی جو دل کی تہہ سے پھوٹتی تھی
اُسے نقشِ سویدا کر دیا ہے

بنا کر دوست میرے چارہ گر کو
مرے زخموں کو گہرا کر دیا ہے

جہاں منزل کے ہیں نے بیج ڈالے
انھیں کھیتوں کو رستہ کر دیا ہے

بہت تھی آئِنے کی آبداری
اِسے نظروں نے میلا کر دیا ہے

مَیں سچّائی اُسے کیسے دکھاؤں
اُسے نفرت نے اندھا کر دیا ہے

محبّت کی گواہی دے کے تُم نے
مجُھے سب میں اکیلا کر دیا ہے

عُمر بھر یہ سوچنے کو رہ گیا
چند لفظوں میں خزینہ بہہ گیا

خود بھی ہے حیران کہ ٹُوٹا نہیں
آئینہ عکسِ ندامت سہ گیا

تیز چلنا تھا کہ تنہا ہو گئی
میرا ساتھی مُجھ سے پیچھے رہ گیا

وقت کی رفتار کتنی تیز ہے
جاتے جاتے کوئی مُجھ سے کہہ گیا

کوئی بستا شہر تو تھا بھی نہیں
دل کھنڈر ہی تھا ، تباہی سہ گیا

چلی شب کے تعاقب میں سحر آہستہ آہستہ
مقفّل ہو گئے آنکھوں کے دَر آہستہ آہستہ

ہَوا کے ساتھ ہو لیں ساعتیں جو ساتھ گزری تھیں
کٹے گا اب جُدائی کا سفر آہستہ آہستہ

اُجڑ جانا کسی آباد بستی کا نہیں مشکل
مگر بستے ہیں ویرانوں میں گھر آہستہ آہستہ

اذیّت کی مجھے یہ انتہا پہ لا کے چھوڑے گا
ڈبوئے گا مری کشتی بھنور، آہستہ آہستہ

تھی اتنی بھیڑ رستے میں کہ اوجھل ہو گئی منزل
چھٹے گا اب غبارِ رہگذر آہستہ آہستہ

بدلتی رُت کے ہاتھوں پھُول تو کُملا گئے سارے
مگر کم ہو گا خوشبُو کا اثر آہستہ آہستہ

مرے دل کی گواہی ایک دن میرا خُدا دیگا
حقیقت آنکھ کھولے گی مگر آہستہ آہستہ

رقص کرتی لہر پہ بس مسکرانا چاہیے
پھینک کے پانی میں پتّھر بھول جانا چاہیے

سر پہ چھت تو پڑ گئی ہے یہ مگر سوچا نہیں
دِل کی بے سمتی کو بھی کوئی ٹھکانہ چاہیے

تلخئ احساس کو اپنا ہدف ملتا نہیں
جو سمولے تیر کو، ایسا نشانہ چاہیے

مُنتقل ہونے سے پہلے سب درودیوار کو
بجلیاں خُود ہی گرا کر آزمانا چاہیے

ہاں نئے آئینے کا بھی عکس اُجلا ہے مگر
کیا پُرانے آئنوں کو ٹوٹ جانا چاہیے؟

کیا خبر یہ شہر میری فتح کے قابل نہ ہو
سوچ کر ہی کشتیوں کو بھی جلانا چاہیے

کیوں مری طرح ابھی راکھ نہیں ہو پائے
یہ مرے دوست مری آگ میں جلنے والے

زرد آندھیوں نے چُھو لیا چہرہ حیات کا
گہنا گیا لباس ہری کائنات کا

شاخیں برہنہ ہجر کی، متقدُور ہو گئیں
انجام بے ثمر تھا ترے اِلتفات کا

اُس کی علامتوں میں فقط تیرگی نہیں
کُچھ تو چراغ سے بھی تعلق ہے رات کا

کُچھ دیر کے لیے تو ہَوا بھی ٹھٹھک گئی
پُوچھا حساب پیڑ نے جب پات پات کا

اُلجھا ہُوا تھا سلسلۂ بیش و کم میں وہ
کُھل کر جواب دے نہ سکا میری بات کا

مَیں نے زباں کی رُو سے نیا تجربہ کیا
اپنی لُغت میں لکّھا نہیں حرف مات کا

چاند نے شب کو چھوڑ دیا ہے
مان سمے کا توڑ دیا ہے

رستے کو محسوس کروں مَیں
اِس لیے چھالہ پھوڑ دیا ہے

مَیں نے اُس کے کھیت کی جانب
رُخ ندّی کا موڑ دیا ہے

آنگن کی دیوار گری تھی
گھر کا گھر کیوں چھوڑ دیا ہے

کِس نے ٹیڑھے عکس کی خاطر
آئینے کو جوڑ دیا ہے

اُس کو کیسا لگتا ہو گا
جِس نے وعدہ توڑ دیا ہے

رُوح کے تیرہ و سنسان جزیرے کو چلا
پھر مرے تشنہ محاذوں سے سرایت کرتا
وہ نگاہوں سے گرا بھی تو ہتھیلی میں گرا

کچھ رتجگے وہ دے گیا کچھ خواب دے گیا
قلب و نظر کو دولتِ کمیاب دے گیا

مجبوریوں کے ہاتھ قلم کر سکا نہ وہ
امرت پلانے والا بھی زہراب دے گیا

زرخیز ہو گئی ہے زمینِ متاعِ فن
ایسا خزینہ درد کا سیلاب دے گیا

ہر انتہا سے موجِ نفس آشنا ہُوئی
ہستی کو لطفِ ساحل و گرداب دے گیا

اتنا تھا اعتبار کہ گل کر دیئے چراغ
مجھ کو نویدِ صُبح جو مہتاب دے گیا

شفق کا شب میں اُترنا عجیب لگتا ہے
تُمھارے ہجر کا موسم قریب لگتا ہے

جو اُس کے پاس ہے وہ بھی تو اُسکے پاس نہیں
مگر وہ شخص مجھے خُوش نصیب لگتا ہے

گھٹا کے بعد کُھلی دُھوپ سے مسیحائی
کبھی کبھی تو فلک بھی طبیب لگتا ہے

کہو تو آٹھ پہر شب کی اوڑھنی رکھوں
تمھیں تو سایہ بھی میرا، رقیب لگتا ہے

عجب فریب ہے، برگد کی چھاؤں کی صُورت
تمھارا، میرا، سبھی کا حبیب لگتا ہے

کتنا موہُوم تھا اے دوست ارادہ تیرا
ایک جھونکے سے ہی گُل ہو گیا وعدہ تیرا

مُجھ کو خدشہ بھی نہ تھا تیرے بدل جانے کا
مَیں نے رکھا تھا خیال اتنا زیادہ تیرا

کس لیے تُو نے گھٹا گیر اندھیرے اوڑھے
مَیں نے تو کرنوں سے دھویا تھا لبادہ تیرا

وہم کا ایک بھنور اُتنا ہی پھر پھیل گیا
جتنا چاہت کا سمندر تھا کشادہ تیرا

جس کے پیروں کو تری سمت نے زنجیر کیا
اُس کے رستے سے تو ٹکرائے گا جادۂ تیرا

مسئلہ اتنا تو پیچیدہ نہیں تھا لیکن
لوگ چالاک تھے اور ذہن تھا سادہ تیرا

آج بھی روشن و رخشندہ ہے
دل، شب و روز اسی زخمِ ملامت کے عوض
اپنے احساس پہ شرمندہ ہے

پُرانا منظر بدل رہا ہے
جو رہ میں جنگل تھا جل رہا ہے

نہ جانے دُکھ کتنا پھیل جائے
جو تیرے سائے میں پل رہا ہے

بُجھے ہُوئے آئینے کی خاطر
وہ غازہ چہرے پہ مل رہا ہے

چٹان رستے میں آگئی ہے
ہے جس کو چلنا، وہ چل رہا ہے

ہے میری کوشش بھی اسمیں شامل
جو لمحۂ موت ٹل رہا ہے

مَیں کتنا بھاگوں گی اُسکے پیچھے
جو دسترس سے نکل رہا ہے

یہ چاند کی شب بھی آخری ہے
زمیں پہ سُورج بھی ڈھل رہا ہے

میں نے بھی ضد میں دِیا چھوڑ دیا
زد پہ آندھی کی جلا چھوڑ دِیا

گُل کو موسم نے سزا دی کیسی
زرد پتّوں میں کِھلا چھوڑ دیا

سانس لیتا ہُوا اِنسان تھا وہ
جس کو ملبے میں پڑا چھوڑ دیا

جس کی اُمید پہ کاٹے مَیں نے
اُس نے ہاتھوں کو کٹا چھوڑ دیا

رنگ بھرنے کا اُسے شوق نہ تھا
پُھول کاغذ پہ بنا چھوڑ دیا

رُخ ہَوا کا تھا کِسی اور طرف
مَیں نے دَر پھر بھی کُھلا چھوڑ دیا

اُس کے کیا پاؤں نہیں ہیں اپنے؟
جس کو رستے میں کھڑا چھوڑ دیا

کِسی نے چند قطرے لے لیے تھے
سمندر آج تک پیاسا ہے، کِتنا

یہ شب کے بعد اندازہ ہوا ہے
سحر کا آئنہ اُجلا ہے کتنا

کوہ کا، دشت کا سہی، کوئی تو سلسلہ رہے
پاؤں میں آبلے رہیں آنکھ میں رتجگا رہے

یاد نہ فرد فرد ہو، دل کی زمیں نہ سرد ہو
ذہنِ رسا کے تار پر لمحوں کا رابطہ رہے

شب کی حکایتوں میں ہو ایسا بھی کوئی سانحہ
جس میں چراغ گُل نہ ہو، سہمی ہُوئی ہوا رہے

ایسا نہ ہو کہ ابر تو برسے مری زمین پر
پانی مگر نہ جذب ہو، سطح پہ ہی کھڑا رہے

ختم ہُوا تھا سلسلہ جس پہ ہمارے ساتھ کا
وادیِ ذات میں وہی حرف نہ گونجتا رہے

خوشی ہے کیا اور رنج کیا ہے
اِک ابتدا ہے اِک انتہا ہے

نہ تھم رہا ہے نہ بڑھ رہا ہے
نہ جانے کیسا یہ زلزلہ ہے

طریقِ اظہار چھین کر بھی
وفورِ احساس دے دیا ہے

نہ گھر گرے گا نہ گھر بسے گا
یہ گھر کے معمار کی سزا ہے

حساب میں جو ہَوا کے سیاہ بخت ہُوئے
وہ شاخ ٹوٹ کے پھر سے نیا درخت ہُوئے

پھر اِس لیے کہ مرا حوصلہ نہ پَست ہُوا
فلک تو آن گرا تھا، زمیں بھی سخت ہُوئی

مٹھاس گھُلتی گئی زہر پھیلتا ہی گیا
نشان چہرے پہ اُبھرے نظر کرخت ہُوئی

مَیں ساتھ دیتی رہی کوئی فیض پاتا رہا
مری حیات کسی دُوسرے کا بخت ہُوئی

ہمیشہ مُجھ پہ اُسی کی دُعا کا رنگ، کھلا
وہ جس کی چھاؤں مری زندگی کا رخت ہُوئی

ہم اُس کا اپنا تشخّص کبھی نہ دیکھ سکے
ستائش اُس کی ہمیشہ بہ تاج و تخت ہُوئی

اِک یہ بھی فیصلہ ہے بہاروں کے باب میں
پھُولوں کے آس پاس کوئی تتلیاں نہ ہوں

گھر سے چلیں تو کوئی دُعا اوڑھ کر چلیں
خالی ہوں کان، ہاتھ میں بھی چوڑیاں نہ ہُوں

تھا جو یادوں کا خزانہ مرے گھر پر رکھا
اُس کی خاطر نہ کبھی پاؤں سفر پر رکھا

پُوچھتا ہے یہ، ترے شام و سحر کی بابت
یاد کا لمحہ جو ہے دیدۂ تر پر رکھا

ایک پَل ہو گا فقط دید کا، جس کی خاطر
مَیں نے صدیوں کو، تری راہگذر پر رکھا

توڑ دے یا اسے خورشید کا ہمسر کر دے
ایک شیشہ ہُوں ترے دستِ ہنر پر رکھا

شام سے پہلے بُجھایا مرا سُورج تُم نے
اور الزام یہ آئینِ سحَر پر رکھا

کتنی سادہ ہے تحریرِ دل
ایک ہی نام پر مشتمل

اپنی ہیئت بدل لیتے ہیں
زخم ہوتے نہیں مندمل

سیلِ احساس کو روک لو
بن گئے ہیں وہ پتّھر کی سِل

شہرِ وحشت کی آب و ہوا
ایک ہی کیفیت مُستقل

مُجھ کو ہنستا ہُوا دیکھ کر
لوگ کیوں ہو گئے مضمحِل

یہ تو ہمّ پرستی تو ہے
پھر بھی دیکھوں میں ہونٹوں کا تِل

دِل کا بیکار سا مشورہ
ہو سکے تو کبھی اُن سے مِل

غم بانٹنے کو آئے، مرے ساتھ رو گئے
کُچھ داغ اور دے گئے، کچھ داغ دھو گئے

آپس میں آس پاس کی سمتیں اُلجھ گئیں
رستہ دکھانے والے مجھے خُود ہی کھو گئے

پہلے گلوں میں مُجھ کو ملایا گلاب سے
پھر سارے زاویوں سے وہ کانٹے چبھو گئے

ہم نے سُنا ہے، وہ تو سمندر سے دُور تھی
لہروں کے خشک ہاتھ جو بستی ڈبو گئے

یوں تو شجر کے سائے میں تاثیر کچھ نہ تھی
ہم ہی تھکے ہُوئے تھے، پڑے اور سو گئے

لہجے کے تیر حرف کا اوڑھے ہُوئے نقاب
تارِ تعلقات میں تلخی پرو گئے

آدرش کی فضا میں حقیقت ٹھہر گئی
خوابوں کے سلسلے تو سبھی، خواب ہو گئے

عجیب ہو گیا کسی کا ساتھ بھی
چراغ بھی تھکا ہُوا ہے، رات بھی

سوال راستے میں ہی کھڑا رہا
جواب بن سکی نہ کوئی بات بھی

خزاں نظر ہَوا کے ہاتھ لگ گئے
گرے ہیں ٹہنیوں سے سبز پات بھی

یہ بات کیا کہ آج تک نہیں رہا
تمہارے ہاتھ میں کسی کا ہاتھ بھی

یہی ثبوت ہے مرے خلوص کا
نیا اُفق دکھا رہی ہے مات بھی

مرے وجود ہی میں بُت شکن بھی ہے
مرے وجود ہی میں سومنات بھی

سفرِ آب پہ کشتی کو روانہ کر کے
کفِ ساحل نے مسافر کو ڈبونا چاہا

اِک سنّاٹا جاتا ہے اور اِک سنّاٹا آتا ہے
پھر بھی یہ دیوار و در کا ڈھانچہ گھر کہلاتا ہے

دھرتی اپنی نمی سے اپنے دامن کو بھر لیتی ہے
ہَوا کا ساتھی کالا بادل بِن ٹھہرے اُڑ جاتا ہے

اِسی لیے کہ ریت پہ تو مٹنے کا خدشہ رہ جاتا
ایک مسافر پتّھر پہ پیروں کے نقش بناتا ہے

میرے اندر کے سونے کو شاید دیکھ نہیں سکتا
نقلی دھاتوں کے زیور جو شخص مجھے پہناتا ہے

کُھلنا مشکل ہو جاتا ہے گرہیں کاٹی جاتی ہیں
جب کوئی رشتوں کے اُلجھے دھاگوں کو سُلجھاتا ہے

ذرا سی دیر کو منظر بہت مکمل تھا
پھر اُس کے بعد مرے راستے میں جنگل تھا

وہ اُڑتے اُڑتے بھی چھاؤں تو دے گیا ہوگا
تہی تھا اب سے، برسا ہُوا جو بادل تھا

دل اپنے وصف میں صحرا بھی تھا سمندر بھی
اُلجھ گیا تو پھر اِک بے کنار دلدل تھا

وہ مثلِ آب تھا شعلوں سے ڈر گیا تھا جو
صفت نہ اپنی ہی جانا، عجیب پاگل تھا

بکھر گیا تو اِک عالم کو وہ دکھائی دیا
ابھی تلک جو ستارہ نظر سے اوجھل تھا

کھِلتے پھُولوں کی ردا ہو جائے
اِتنی حسّاس ہوا ہو جائے

مانگتے ہاتھ پہ کلیاں رکھ دے
اِتنا مجبُور خُدا ہو جائے

دل میں اِک ٹیس سی بن جاتا ہے
جس تعلق کو بقا ہو جائے

مَیں خزاؤں کو لہو دے آؤں
پھر اگر پیڑ ہرا ہو جائے

گرد جھڑ جائے مرے بالوں سے
اُس کا بھی چہرہ نیا ہو جائے

یاد رکھے مری تنہائی کو
چاہے وہ مُجھ سے جُدا ہو جائے

دھیان کو حُسنِ تجلی دے کر
فاصلہ برق نما ہو جائے

وہ جو طُوفاں میں لگا تھا کبھی ساحل کی طرح
چُھٹتا جاتا ہے، بچھڑتی ہُوئی منزل کی طرح

ایک قطرہ ہوں مگر نکلی ہوں دریا کی طرف
آب بستہ نہ ہُوئی ہیں کسی بُزدل کی طرح

ہے برابر مری تشریکِ سرِ جرمِ نظر
مجھ کو دی جائے سزا بھی مرے قاتل کی طرح

دائرے کتنے ہی بن جائیں پہ مرکز ہے وہی
اپنے اندر کسی پابندِ سلاسل کی طرح

یہ ضروری تو نہیں ہے کہ وہ دشمن ہو مرا
نظر آتا ہے اگر مدِّ مقابل کی طرح

مری آنکھوں کے آئینے میں تصویرِ ہنر دیکھو
ستاروں کا سفر ہمراہ میرے رات بھر دیکھو

نہ یہ پوچھا کرو میں کس لیے خاموش رہتی ہوں
کبھی میری خموشی کے معانی جان کر دیکھو

وہ خوشیاں بانٹنے والا تو اب دُکھ بھی نہیں دیتا
مرا محسن ہے مجھ سے آج کتنا بے خبر دیکھو

یہاں اُس کی بھی یادوں اور ارادوں کے دفینے ہیں
یہیں پر بیٹھ کر تا عمر اُس کی رہگذر دیکھو

اسیری میں اڑانوں کا خیال آتا رہا مجھ کو
مرے پر نوچنے والو مرا عزمِ سفر دیکھو

ایک ہی حلقۂ زنجیر میں رہنا ہو گا
رُوح کو جسم کی تعزیر میں رہنا ہو گا

حکم ہے زیست کے سفّاک تقاضوں کا یہی
خواب کو حسرتِ تعبیر میں رہنا ہو گا

متّصل، دیکھ، کئی اور بھی گھر ہیں تجھ سے
دل، تجھے کاوشِ تعمیر میں رہنا ہو گا

تیری چاہت میں تغافل کے جو لمحے ٹھہرے
اُن کو بھی یاد کی تصویر میں رہنا ہو گا

نکلی گہنائی ہُوئی دُھوپ تو یہ بھید کھُلا
صبح کو شام کی تزویر میں رہنا ہو گا

جس دن وہ مجھ سے اُلجھا تھا
سارے بندھن بھُول گیا تھا

مَیں نے آنکھیں موند کے دیکھا
وہ بھی مُجھ کو دیکھ رہا تھا

میں اُس کی باتیں کرتی تھی
وہ اپنی باتیں کرتا تھا

اب کہنے کو جی ہی نہ چاہے
وہ کیا کیا مجھ سے کہتا تھا

وہ جھوٹی باتوں کا عادی
سچّے لوگوں سے ڈرتا تھا

اپنے اُوپر خول چڑھا کر
اپنے جیسوں سے ملتا تھا

کچھ احساس کی مایہ کم تھی
کچھ کانوں کا بھی کچّا تھا

ٹوٹنے سے پہلے اِک تارا
کِتنی شدّت سے چمکا تھا

چاروں جانب دریا، جس کے
اُس بستی میں قحط پڑا تھا

زرد ہُوا ، کُملایا چہرہ
اُس کی آنکھوں سے کِھلتا تھا

اُس موسم کا عکس دکھاؤ
جس موسم میں باغ ہرا تھا

آخر کِس کے حِصّے آتا ؟
دِل تھے دو اور ایک دیا تھا

وہی کتھا تھی ، وہی صحیفہ
لکھنے والا ہاتھ نیا تھا

ہیں سرِ بزمِ وفا نازشِ محفل ٹھہروں
صُورتِ شوق جلوں، تیرے مقابل ٹھہروں

زہر بکھرے کہ ترے حرف سے تریاق بنے
ہر کنایے میں تری بات کا حاصل ٹھہروں

زخم دیکھوں تو مسیحائی کا الزام لگے
پھیر کر آنکھ پلٹ جاؤں تو قاتل ٹھہروں

میرے اطراف چٹانیں ہوں گھنا جنگل ہو
جس کا رستہ ہی نہ ہو کوئی وہ منزل ٹھہروں

بعد برسوں کے کھنڈر جس کے کریدے جائیں
جس پہ اُترے نہ کبھی کوئی وہ ساحل ٹھہروں

حدوں کو بھول جانا چاہتی ہوں
خلاؤں میں ٹھکانہ چاہتی ہوں

مناظر گھول کر آسودگی کے
مَیں آنکھوں پر لگانا چاہتی ہوں

مَیں لہجے گوندھ کر میٹھے سُروں کے
سماعت کو سُنانا چاہتی ہوں

جو دریا تہہ تلک سُوکھا ہُوا ہے
مَیں اُس میں ڈوب جانا چاہتی ہُوں

لکھا ہے ریت پر پیغام مَیں نے
وہاں پھر ا بیٹھانا چاہتی ہُوں

وہ جس کے دَر مقفّل ہو گئے ہیں
اُسی گھر کو بسانا چاہتی ہُوں

ہُوئی تخلیق جس مٹّی سے میری
اُسی کا آب و دانہ چاہتی ہُوں

کِسی کی بے رُخی کا لمحہ
مَیں قصدًا بھُول جانا چاہتی ہُوں

بند آنکھوں میں بہتے ہُوئے خواب تھے
نیند ٹوٹی تو دریا وہ بے آب تھے

ایک سُورج بُجھا اور سب بُجھ گئے
میرے ماتھے پہ کتنے ہی مہتاب تھے

لوگ چاہت میں اک دُوسرے کیلئے
جتنے بیتاب تھے اُتنے کمیاب تھے

سبز ہوتی نہ فصلِ مہ وسال کیوں
کھیت آنکھوں کے پانی سے سیراب تھے

برق کی روشنی ہی دکھاتا فلک
چاند، سُورج ، ستارے تو نایاب تھے

سلسلہ فہم کا منقطع ہوگیا
بند کی اوٹ یادوں کے سیلاب تھے

بہت نم ہے زمیں دیکھو کہیں پودے نہ جل جائیں
کہ پیاسے کو بقدرِ ظرف ہی پانی بھی دیتے ہیں

احسان کسی اور کے سر جائے تو اچھّا
شیرازۂ دِل میرا بکھر جائے تو اچھّا

جب گاؤں گھروندوں نے سپر ڈال ہی دی ہے
چڑھتا ہُوا دریا بھی اُتر جائے تو اچھّا

کچھ اِس سے زیادہ نہ کرو عرضِ تمنا
اب زخمِ طلب دید سے بھر جائے تو اچھّا

مانا کہ تمھیں راہ کمک دیتی رہے گی
کُچھ ساتھ مگر زادِ سفر جائے تو اچھّا

بستی میں پہنچ کر یہ کہیں یاد نہ آئے
صحرا میں بھی کچھ وقت گذر جائے تو اچّھا

مَیں ہُوں کہ تواضع کا ہنر بھُول گئی ہُوں
مہمان کِسی اور کے گھر جائے تو اچّھا

اچھا ہے میرا گھر بھی
دیواریں بھی ھیں در بھی

رات گئے خاموشی سے
مجھ کو لگتا ہے ڈر بھی

پیاس تھی میٹھے پانی کی
تھا لاچار سمندر بھی

آنکھیں کیوں بھر دیتا ہے
اتنا پیارا منظر بھی

اُس کو پانی لگتا ہے
میری آنکھ کا گوہر بھی

توڑ کے اِک آئینے کو
ڈرا ہُوا ہے پتھر بھی

دستک دیئے جاؤ کوئی در وا نہ کروں گی
دیکھو مرا دل عام گزرگاہ نہیں ہے
یہ گھر ہے مرا میں اسے رستہ نہ کروں گی

کون سی ساعت دکھائے گی گھروں کا سلسلہ
ختم ہوتا ہی نہیں ہے پتھروں کا سلسلہ

روح کے اندر نہیں اُترا تو پھر کس کام کا
سبز، پیلے اور نیلے منظروں کا سلسلہ

ناتواں پرواز تھی پھر بھی پرندے اُڑ گئے
دیکھتا ہی رہ گیا جھڑتے پروں کا سلسلہ

پیچھے مُڑ کر راستہ دیکھا تو آئے گا نظر
جا بجا درجہ بہ درجہ مقبروں کا سلسلہ

ق

بھیڑ میں سارے ہی چہرے ایک سے لگنے لگے
اِک سمندر کی طرح پھیلا سَروں کا سلسلہ

اور پھر کچھ دیر میں منظر کا حصّہ بن گیا
میلی، بوسیدہ پرانی چادروں کا سلسلہ

حدوں کی بات، فصیل و قفس کی بات نہیں
یہاں سے کُوچ ہمارے ہی بس کی بات نہیں

یہ ایک دو کا نہیں، شہر بھر کا ماتم ہے
چمن کی موت ہے یہ، خار و خس کی بات نہیں

مجھے قبُول نہیں اِس کی آبرُو ریزی
یہ صدقِ دل کی ہے، حرص و ہوس کی بات نہیں

خوشا کہ شب تو مری ہے، اگرچہ چاند ابھی
مِرے نصیب مری دسترس کی بات نہیں

قتل کی سازش تھی تیرے لہجۂ سفّاک میں
تیز خنجر جا لگا میری رگِ ادراک میں

پہلے پہلے رونے والے وہ بھی آئے گا مقام
جب سمندر جم رہیں گے دیدۂ نمناک میں

کس طرح کاوش کی لذّت کا ہو اندازہ اُسے
جس کو موتی مل گیا ہے ایک مُٹّھی خاک میں

لَوٹ جانے کے ارادے سے یہاں آیا تھا جو
کچھ اُلجھ کر رہ گیا حالات کے پیچاک میں

اک سفر کی ابتدا تھی اک اشارہ آنکھ کا
داستاں کی داستاں تھی جُنبشِ بیباک میں

مَیں لڑکھڑائی جہاں بھی، مِرے قریب رہا
ترا خیال مری ذات کا منیب رہا

نہ اُس کا نام، نہ تھی ہاتھ پہ لکیر کوئی
بڑے طویل سفر کا جو ہم نصیب رہا

سپاٹ چہرے پہ لکھی ہُوئی کہانی ہُوا
سو اپنی طرز کا وہ منفرد ادیب رہا

رہی ہے جنگ ضروری مفاہمت کیلئے
کِسی سے ربط کا بھی سلسلہ عجیب رہا

حصارِ ہجر میں دُنیا سے بے نیاز رہی
ترے قیام کا لمحہ مرا حبیب رہا

بس اِتنا یاد ہے پہلا قدم پڑا تھا کہیں
پھر اُس کے بعد بہت راستہ مہیب رہا

کبھی چھلکائے ہیں آنسو خوشی میں
کبھی غم کو اُڑایا ہے ہنسی میں

بضد ہو تم کہ میں مانوں تمہاری
کہو کیا لطف ہے اِس سرکشی میں

نگاہوں سے تکلّم ہو رہا ہے
قیامت کا سماں ہے خامشی میں

ہُوئی ہے آگ سے جب سے رفاقت
دُھواں پھیلا ہُوا ہے زندگی میں

مجھے احساس کی حد پہ بُلا کر
بہُت کچھ کہہ گیا وہ بے حسی میں

بہت پھیکا لگا ہے چاند مجھ کو
اُسے دیکھا ہے جب بھی روشنی میں

مجھے اُس کے نہ آنے کا یقیں تھا
پُکارا تھا اُسے جب بے بسی میں

تُم نے دُکھ اِس قدر دیا مُجھ کو
بے یقینی سے بھر دیا مُجھ کو

ایک سُنسان سے جزیرے پر
ایک پیارا سا گھر دیا مُجھ کو

راستہ دو قدم بتایا اور
کتنا زادِ سفر دیا مُجھ کو

میری صُورت بگاڑ دی اُس نے
آئنہ بے ہنر دیا مُجھ کو

قتل کر کے مِرے گواہوں کو
اُس نے خاموش کر دیا مُجھ کو

بن گئے پھُول باعثِ رونق
پیڑ جو بے ثمر دیا مُجھ کو

چاندنی چاند کی شہادت ہے
اور وہی اس کی دسترس میں نہیں

مانا کہ بے کنار سمندر تھے راہ میں
ساحل بھی جھلملاتے رہے ہیں نگاہ میں

میرا بھی ایک نام ہے میرا بھی اک مقام
یہ بھول ہی گئی تھی مگر اُس کی چاہ میں

اک پیکرِ حیات ہے، اک طالبِ حیات
اتنا ہی فرق آیا نظر مہر و ماہ میں

اِنساں کے ساتھ رہتا ہے اُسکا ضمیر بھی
لذت نہیں ہے ایسی بھی کوئی گناہ میں

خواہش ہے ذرا دُھوپ کا بھی ذائقہ چکھوں
اِک عمر سے رہی ہوں شجر کی پناہ میں

گھر کے گھر کا پتہ نہیں چلتا
اِس نگر کا پتہ نہیں چلتا

آئنے اِنتظار کرتے ہیں
شیشہ گر کا پتہ نہیں چلتا

جسم و جاں سے جو ماورا دیکھے
اُس نظر کا پتہ نہیں چلتا

کِس کے ہمراہ چل رہا ہے وہ
ہمسفر کا پتہ نہیں چلتا

آدمی کھو گیا خلاؤں میں
بحر و بر کا پتہ نہیں چلتا

اِک خبر شہر بھر میں پھیلی ہے
فتنہ گر کا پتہ نہیں چلتا

مَیں نے خُود ہی بُجھا دیا ہو گا
جس شرر کا پتہ نہیں چلتا

ایک ہی پر تھا بچا اور وہی ٹُوٹ گیا
طائرِ جاں سے اُڑانوں کا نگر چُھوٹ گیا

روشنی اوڑھ کے بے خوف و خطر سویا تھا
جس مسافر کو اندھیرے میں کوئی لُوٹ گیا

کتنی چھوٹی سی تعلق کی کہانی ہو گی
آبلہ راہ کو چُھوتے ہی اگر پُھوٹ گیا

کچھ تو طغیانی نے کھینچا اسے اپنی جانب
کفِ ساحل سے بھی کشتی کا کڑا چُھوٹ گیا

مسلسل ایک ہی تصویر چشمِ تر میں رہی
چراغ بجھ بھی گیا روشنی سفر میں رہی

رہِ حیات کی ہر کشمکش پہ بھاری ہے
وہ بے کلی جو ترے عہدِ مختصر میں رہی

خوشی کے دَور تو مہماں تھے آتے جاتے رہے
اُداسی ڈال کے ڈیرے ہمارے گھر میں رہی

ہمارے نام کی حقدار کس طرح ٹھہرے
وہ زندگی جو مسلسل ترے اثر میں رہی

نئی اُڑان کا رستہ دکھا رہی ہے ہمیں
وہ گرد پچھلے سفر کی جو بال و پر میں رہی

تنہا سفر کروں گی اگر ہم سفر نہیں
پھر راستے میں کیا ہو مجھے اسکا ڈر نہیں

دِل تو کھڑا ہُوا ہے سرِ روزنِ اُمید
کب سے اگرچہ تازہ ہوا کا گُزر نہیں

جس پہ کِھلی کِسی کے لہُو کی بہار ہو
ایسی کوئی لکیر مرے ہاتھ پر نہیں

کِس کِس کے آشیانوں کو برباد کر گئیں
جن آندھیوں کے راستے میں میرا گھر نہیں

ہاں بُھوک بن گئی ہے مِرے شہر کا نصیب
گرچہ کسی پہ بند کسی کا بھی دَر نہیں

اپنے ہی شاہکار پہ تنقید کر سکے
کیا ایسا خود شناس کوئی نقش گر نہیں؟

ایک احساس کے دیرینہ اثر سے نکلیں
کیوں کڑی دُھوپ میں ہم اپنے ہی گھر سے نکلیں

خوف کی آڑ لئے پُشت سے جو وار کریں
جیت کر لوگ وہ کیا مات کے ڈر سے نکلیں

یہ مسافر ہیں کسی راہ کے ٹھکرائے ہُوئے
لَوٹ آئے ہیں تو احساسِ سفر سے نکلیں

اب ارادہ ہے اِسی بھید کی گلیاں گھُومیں
ساحلِ درد کی خاطر نہ بھنور سے نکلیں

سوچ کی بانہیں ترے دوشِ اُفق تک پہنچیں
اب اُڑانوں کی یہ خواہش ہے کہ پر سے نکلیں

اپنے اشکوں سے کہو چشمِ قلم سے برسیں
محبسِ جاں کے کسی ایک ہی دَر سے نکلیں

یوں نہ کانٹوں میں شب و روز پروئی جاؤں
سیلِ احساس کی خوشبو میں بھگوئی جاؤں

یاد آؤں کسی لمحے کو بڑی شدّت سے
مَیں کسی آنکھ سے چھلکوں کبھی روئی جاؤں

کشتِ ویراں میں محبّت کی کہانی لکھّوں
صورتِ حرفِ وفا ریت میں بوئی جاؤں

کبھی تتلی کی طرح پنکھڑی چُوموں تو کبھی
گوہرِ نم کی طرح گُل میں سموئی جاؤں

ماسوا ایک، کوئی اور نہ بھائے مُجھ پر
ایک ہی رنگ میں ہر بار ڈبوئی جاؤں

ایک اعزاز کی صورت مجھے پائے کوئی
اور اعزاز کی صُورت ہی میں کھوئی جاؤں

گھر کی چھت پر کھیلتی برسات کی آواز تھی
ہاتھ پکڑے ساتھ دیتی رات کی آواز تھی

میرے ہونٹوں پر کھڑی پہرا دیا کرتی تھی جو
بات کو زنجیر کرتی ذات کی آواز تھی

وقت کے حیرت کدے میں بولتی رہتی تھی جو
بے یقینی کی علامت، مات کی آواز تھی

گونجتی جو رُوح کی خلوت سرا میں بارہا
میری سرگوشی کی، اُس کی بات کی آواز تھی

میرے اندر کی خموشی .بولتی تھی آنکھ سے
رقص کو ڈھولک سُناتی ، ہات کی آواز تھی

حرف سارے اُسکے تازع جُھومتے یا ڈولتے
لے بدلتی گیت .میں حالات کی آواز تھی

برنگِ سُرخ، چہرہ کرب کا، تصویر ہوتا ہے
لہُو کے آبشاروں سے ہنر تعمیر ہوتا ہے

نگہ انسان کی بس ایک حصّہ جذب کرتی ہے
بہت کچھ آسماں پہ رات دن تحریر ہوتا ہے

رسائی کا ذریعہ ہی نہ ہو تو فیصلہ کیسا
کہ رستہ ہو جہاں پر، گھر وہیں تعمیر ہوتا ہے

بہت آسودگی دیتا ہے یا تکلیف کی شدت
کوئی لمحہ جہاں احساس میں زنجیر ہوتا ہے

محبّت اور نفرت کی گواہی ایک ہوتی ہے
کہ دونوں ہی میں تنکا آنکھ کو شہتیر ہوتا ہے

ہر اک کو اپنی اپنی چھت کے نیچے نیند آتی ہے
بہت چھوٹا سا گھر بھی صورتِ جاگیر ہوتا ہے

پختہ یقین تھا جسے صبحِ مآل پر
اب چونک سا گیا ہے سفر کے سوال پر

بارش کے بعد مہرباں بادل گزر گیا
دھرتی بہت اُداس ہے زخمِ وصال پر

دستِ شفا تو زخمِ مسیحائی دے گیا
اب کس کا نام لکھوں رہ اندمال پر

موسم کی آنکھ سے تو توقع نہ تھی انہیں
کلیوں کو اعتبار تھا اپنے جمال پر

اِک نقش ہے جو مٹ کے دوبارہ بنا کیا
اِک پھول ٹوٹ کر بھی مہکتا ہے ڈال پر

صحرا میں چلنے والوں کو وجہِ نوید ہو
سورج کی روشنی ہے اب اپنے زوال پر

آئے ہیں شہرِ شہر سے شیشہ گرانِ وقت
تکرار ہو رہی ہے آئینے کے بال پر

دَر بند مکانوں کے مکیں اور کیا کرتے
دُنیا کو دیکھ آئے ہیں رخشِ خیال پر

اپنے ربّ سے

بانجھ بے خواب نظر
دیدۂ پر آب
گراں گوش سماعت
لبِ سربستہ و حیران
حرف ، معنی کے تعلق سے پشیمان
ذہن پژمردہ ، دلِ افسردہ
زرد بیمار مسافت کی تھکن
بارِ سخن —

نقشِ بے داد کو پستی سے اُٹھانے والے
دستِ بے مایہ کو آئینہ دکھانے والے
زندگی کرنے کا احساس دلانے والے
مضطرب رُوح کو سینے سے لگانے والے
اسمِ احمدؐ کا دیا دل میں جلانے والے
تجھ کو اِس نام کی حرمت کی قسم
اپنے محبوبؐ کی عظمت کی قسم
حشر کے روز محبّت کی گواہی دینا!

اعلیٰ تعلیم یافتہ اور فنونِ لطیفہ کی
شائق یاسمین حمید اگرچہ ایسی آسودہ اور
مطمئن خاتونِ خانہ ہے جس کا محورِ زیست
خوش ذوقی سے آراستہ گھر، شوہر اور بچے
ہیں۔ تاہم شاعرہ یاسمین نے اپنے لیے
الگ جہانِ تخلیق بھی آباد کر رکھا ہے۔
یہ تصوّرات اور محسوسات کی دُنیا ہے۔
شائستہ لہجے میں ہمکلام ہونے والی یاسمین حمید
بحیثیت یاسمین کیا محسوس کرتی ہے،
جب اسکا اظہار تخلیقی سطح پر ہُوا تو شعر
نے جنم لیا۔ شاعرہ نے شخصیّت کے
نہاں خانے میں تخلیقی سفر کی منزلیں سَر
کیں تو سائیکی کے لینڈ سکیپ سے تخلیق
کے پھُول حاصل کئے۔ ایسے پھُول جن
کی مہک میں نئے پن کی دلنوازی ہے۔
وہ تخلص کے ذریعہ سے مقطع میں تعلّی
یا خود نمائی نہ کرنے کے باوجود بھی شعر کو
ذات کا استعارہ بنا دیتی ہے:

مَیں ساتھ دیتی رہی کوئی فیض پاتا رہا
عمری حیات کسی دُوسرے کا بخت ہُوئی

ڈاکٹر سلیم اختر
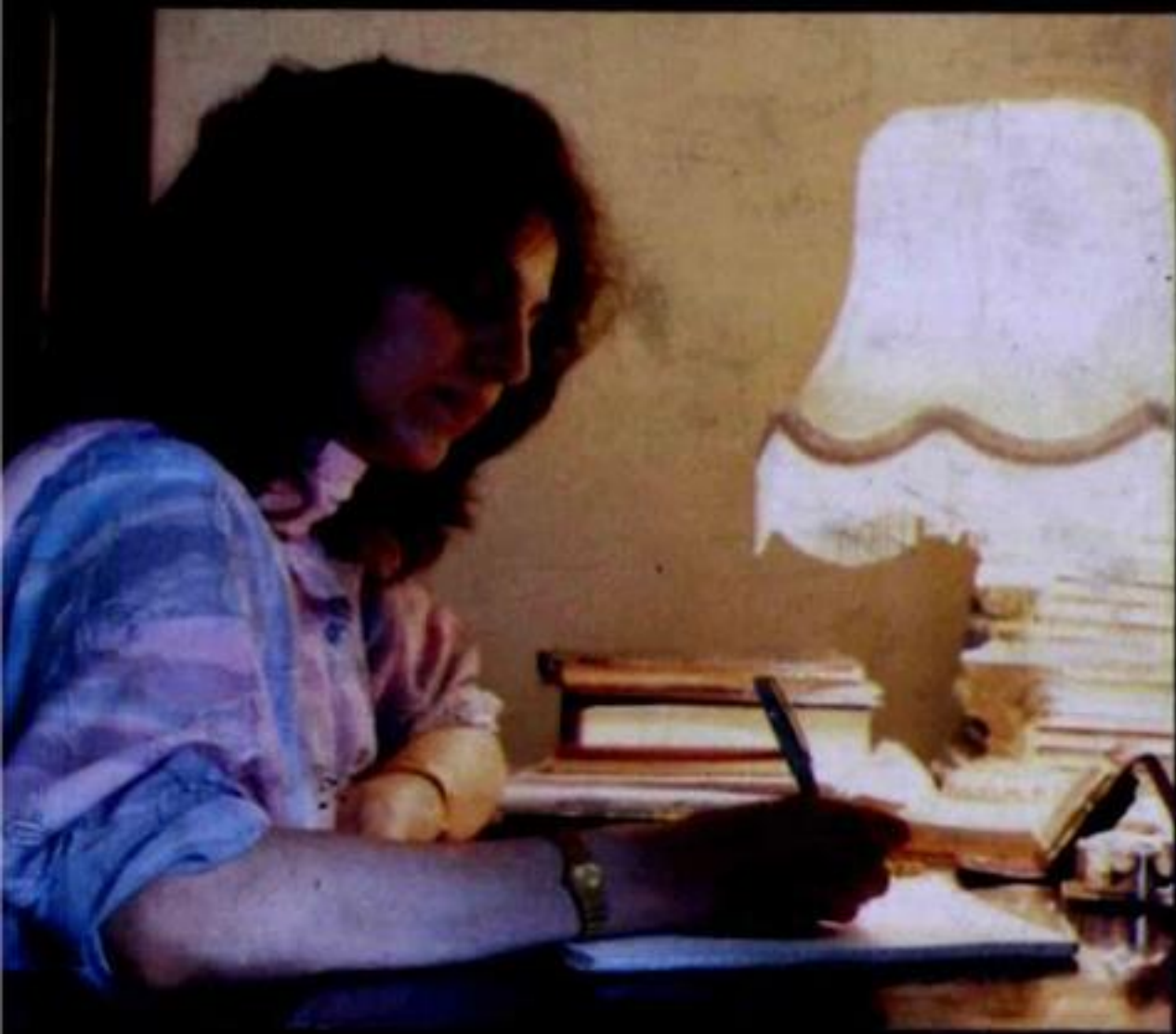
ناگہاں کوئی نہ آثار مٹا دے اِس کے
نقش اِک اور پسِ نقش بنائے رکھنا

یاسمین حمید

پسِ آئینہ